مقالۂ افتتاحیہ

ہماری قومی زبان

رئیس احمد جعفری

اصولی طور پر اردو ہماری قومی زبان تسلیم کی جا چکی ہے اور ہمیں یہ عرض کرنے میں بھی کوئی تکلف نہیں کہ صوبائی اور مرکزی حکومت کی طرف سے اس کے حفظ و بقا، اور ترویج و اشاعت کی مخلصانہ کوششیں جاری ہیں، اور اس سلسلے میں لاکھوں روپیہ ہر سال صرف کیا جاتا ہے۔ اور یہ رائگاں نہیں جاتا کام بھی خاصا ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ محکمۂ اوقاف اور غیر مسلم وقف کی طرف سے تصنیف و تالیف کا جو کام جاری ہے اس کی نوعیت و کیفیت اگرچہ بحث طلب ہو، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے بھی اردو کے فروغ و احیاء میں کافی مدد مل رہی ہے۔ نیم سرکاری یا حکومت کی مدد پانے والے اداروں یا بالکل نجی لٹریری اداروں کی طرف سے اردو کے سلسلے میں جو کام ہو رہا ہے وہ بھی ہر آئینہ مستحسن اور قابل تعریف ہے۔

با ایں ہمہ اب تک اردو کو اس کا اصل مقام حاصل نہیں ہو سکا، اور اگر لیل و نہار یہی رہے تو ہمیں شبہ ہے کہ اس میں اتنی مدت لگ جائے گی جس کی تعیین مشکل ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے؟

اس کا صرف ایک ہی سبب ہماری سمجھ میں آتا ہے۔

اور وہ سبب یہ ہے کہ سرکاری حکام و عمال از خود اس طرف توجہ نہیں کرتے اور حکومت انھیں اردو میں کام کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہتی، اور جب تک اردو دفتروں میں اور سیکریٹریٹ میں رائج نہ ہو جائے اس وقت تک اسے قومی زبان کہنا صرف دل کو خوش کر لینا ہے حقیقت

اور واقعہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

سرکاری دفتروں اور سیکرٹیریٹ کے حکام والا مقام کو ہم کیا کہنے کا حق رکھتے ہیں، جب کہ اردو کشی اور اردو سے بے نیازی کا عام وطیرہ ہم ان اداروں میں بھی دیکھتے ہیں جن کے قیام کا مقصد صرف اردو کی ترویج و اشاعت ہے اور جن کی طرف سے اردو کی کتابوں پر بے دریغ روپیہ صرف ہوتا ہے۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ان اداروں کی مجالس انتظامیہ کی کارروائی انگریزی میں لکھی جاتی ہے، تجویزیں انگریزی میں ہوتی ہیں، فیصلے انگریزی میں صادر کیے جاتے ہیں، جاہل چپراسیوں تک کو علیحدگی کے جو نوٹس، یا تقرر کے جو پروانے عطا ہوتے ہیں وہ انگریزی میں ہوتے ہیں —— یہ اگر سچ ہے تو ظلم اسے کیا کہتے ہیں؟

جہاں حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کو اردو کی ترویج پر مجبور کرے وہاں ہمارے دانشور طبقے کا بھی فرض ہے کہ وہ ادبی اداروں کو مجبور کرے کہ صرف اردو میں کتابیں چھاپنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ یہ ادارے باقاعدہ طور سے اپنی کارروائیاں اردو میں لکھا کریں، خط و کتابت اردو میں کریں، اور سارے تحریری امور اردو میں انجام دیں۔

حکومت اور دانشور طبقے کے ساتھ ساتھ کچھ ذمے داریاں ان لوگوں پر بھی عائد ہوتی ہیں جو خود کو اردو کا پاسباں اور نگہباں کہتے ہیں۔ کام صرف باتوں سے نہیں چلا کرتے، عمل کی بھی ضرورت ہے۔ عمل کا کیسہ اگر خالی ہو تو طوفان تکلم کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے؟

بعض حلقوں کی طرف سے اردو کی بے مائگی اور تہی دامنی پر وقتاً فوقتاً وعظ و تلقین کا جو نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے اسے بھی اب ختم ہو جانا چاہیے۔ اتنی بے بنیاد بات کو بار بار دہراتے رہنا نہ اظہار دانش ہے نہ معقولیت پسندی کا مظاہرہ۔

ریاست حیدرآباد دکن، ریاست بھوپال، ریاست رام پور، ٹونک، ریاست کشمیر، ریاست گوالیار، ریاست جے پور وغیرہ تقریباً سب ہی مسلم اور غیر مسلم ریاستوں میں کم و بیش سو سال تک اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل رہی، اگر اردو میں یہ اہلیت نہیں تھی تو آخر

ان والامقام ریاستوں کا کاروبار حسن و خوش اسلوبی کے ساتھ اتنی طویل مدت تک کس طرح انجام پاتا رہا؟

تعلیمی اعتبار سے بھی اردو کی تہی مائگی کا رونا صرف ستم ظریفی کا کمال ہے۔ حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی اور وہاں کے تمام کالجوں اور مدرسوں میں اردو ہی ذریعۂ تعلیم تھی۔ ڈاکٹری انجینیرنگ، فلسفہ، ہیئت، کوئی علمی یا فنی موضوع ایسا نہیں تھا جو اردو میں نہ پڑھایا جاتا ہو، اسی طرح مولانا محمد علی مرحوم کی قائم کی ہوئی جامعۂ ملیہ اسلامیہ میں بھی تمام علوم و فنون اردو پڑھائے جاتے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ دونوں کے فارغ التحصیل طلبہ نے لندن، برلن، اور پیرس سے اعلیٰ ترین ڈگریاں لیں۔ اور غیر ملکی یونیورسٹیوں کے اساتذہ نے ان طلبہ کے مقابلے میں ان کی استعداد اور ذہانت کو سراہا، جن کا ذریعۂ تعلیم انگریزی رہا تھا۔ پاکستان میں ڈاکٹر محمود حسین خاں، سابق وزیر تعلیمات حکومت پاکستان (موجودہ صدر شعبۂ تاریخ کراچی یونیورسٹی) اور ڈاکٹر رضی الدین سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی (سندھ یونیورسٹی (موجودہ وائس چانسلر اسلام آباد یونیورسٹی) کے نام خاص طور پر ہم لینا چاہتے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فرزند دلبند ہیں، اور ثانی الذکر عثمانیہ یونیورسٹی کے پسر والا قدر!

بہرحال وقت آگیا ہے کہ انگریزی کو جلد از جلد دانش گاہوں، اداروں، اور سرکاری دفتروں سے رخصت کیا جائے، اور اس کے بجائے اردو کو نافذ کیا جائے۔

ہمیں امید ہے، ہماری اس درخواست پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا!

اور ہماری اس امید کی بنیاد یہ ہے کہ اس وقت مرکز میں اور صوبے میں جو اصحاب برسر اقتدار ہیں ان کا اخلاص، اور اردو سے ان کا شغف ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان حضرات کے دور میں یقیناً یہ کام جسے خواہ مخواہ دشوار بنا دیا گیا ہے بڑی آسانی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پاسکتا ہے، اور اگر خدانخواستہ یہ دور بھی صرف امید کے سہارے گزر گیا تو پھر امید کی جگہ اگر یاس لے لے تو کوئی

حیرت کی بات نہیں ہوگی۔

اسے واسئے ہمارے اگرامینٹ ہمارے

اگر واقعی اردو کو اس کا صحیح مقام دینا ہے تو پھر حرکت اور عمل کا آغاز ہو جانا چاہیے خواہ شروع شروع میں وہ محدود اور مختصر پیمانے پر کیوں نہ ہو، صرف نظریاتی طور پر آج تک دنیا کا کوئی مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکا ہے۔ ہر نظریے کے ساتھ عمل کا جلو میں ہونا بسا ضروری اور لازمی ہے۔ بقول اقبال :

پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے